سبینہ اویس
اُستاد، شعبہ اُردو
گورنمنٹ کالج خواتین یونی ورسٹی، سیال کوٹ

فیض کی شاعری میں مزاحمتی عناصر

ABSTRACT

Elements of resistence in Faiz's poetry
By Sabeena Owais, Assistent Prof., Department of Urdu, Govt. College Women University, Sialkot.

The history of protest and defiance dates back to start of human civilization. This article analyses elements of revolt and resistance in poetry and works of famous poet Faiz Ahmad Faiz and the features of his poetry that distinguish him from contemporary poets. The peculiarity of Faiz's poetry lies in his ability to portray bitter realities without compromising tone. His poetry discusses the predicament of life in general and inequalities of society in specific. All these characteristics marke Faiz a revolutionalry poet. This article analyses the resistence elements in Faiz's poetry.

ادب زندگی کا عکاس ہے۔ اگر اس کے تاریخی ارتقا پر نگاہ ڈالی جائے تو یہ موجود سے غیر مطمئن رہا ہے، غیر موجود کا دلدادہ رہا ہے اور اس کا رُخ بے چینی کی طرف رہا ہے۔ ادب کی بنیاد متخیلہ پر ہوتی ہے۔ شاید اسی لیے تحرک اور تبدیلی اسے پسند آتی رہی ہے۔ ادب کے مزاج کی اسی بے چینی کا رنگ بعض اوقات بغاوت کی صورت اختیار کر جاتا ہے۔ جب انسانی تہذیب وتمدن کی تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ مزاحمت کی روایت خود انسانی زندگی کے جتنی ہی پرانی ہے، ظلم اور اس کے خلاف مزاحمت اور احتجاج کا سلسلہ تو حضرت آدم کے بیٹوں سے ہی شروع ہو گیا تھا تب سے لے کر آج تک یہ سلسلہ جاری وساری ہے۔

مزاحمت عربی زبان کے لفظ ''زخم'' سے مشتق ہے جس کے لغوی معنی حریف سے ٹکرانے یا مدافعت کے ہیں۔ اصطلاحی معنی میں مزاحمت سے مراد وہ طرزِ عمل ہے جو کسی ناموافق صورتِ حالات کو اپنانے سے انکار اور ناآسودگی کا اظہار ہے۔ ادب میں مزاحمت سے مراد یہ ہے کہ اگر ادیب موجودہ صورتِ حالات سے مطمئن نہ ہو۔ جبر واستحصال کے خلاف آواز بلند کرے تو عمومی معنوں میں ایسا ادب مزاحمتی ادب کے زمرے میں شامل ہوگا۔ اس حوالے سے اُردو ادب کی تاریخ پر نگاہ ڈالی جائے تو شمالی ہند میں شاعری کا آغاز ہی مزاحمتی رویے سے ہوا اور جعفر زٹلی پہلا مزاحمتی شاعر تسلیم کیا جاتا ہے۔ اگر پاکستان کی مزاحمتی شاعری پر نظر دوڑائیں تو یہاں بھی مزاحمت کا رنگ وافر مقدار میں موجود ہے۔ خصوصاً تقسیمِ ہند، تقسیمِ

پاکستان اور ذوالفقار علی بھٹو کی پھانسی کے پس منظر میں کی گئی شاعری میں حزن وملال کی کیفیت اتنی شدید ہے کہ اس پر بین یا نوحے کا گمان ہوتا ہے۔ اس تعلق سے پاکستانی شاعری کے عمومی رجحان کے عین مطابق فیض کی شاعری میں یہ رنگ تقسیمِ پاکستان کے وقت سے گہرا نظر آتا ہے۔ اس سلسلے میں اُن کی نظم ''حذر کرو مرے تن سے'' توجہ طلب ہے۔ اس نظم میں شاعر کا نفس انگارے کے مانند دہک رہا ہے وہ تقسیم کے دہانے پر کھڑے پاکستان کے مشرقی بازو میں کھیلی جارہی خاک و خون کی ہولی سے ہراساں ہے۔

سجے تو کیسے سجے قتلِ عام کا میلہ
کیسے لبھائے گا میرے لہو کا واویلا (۱)

علاوہ ازیں فیض کی نظمیں ''لوح وقلم''، ''درد آئے گا دبے پاؤں''، ''جشن کا دن''، ''خوشا ضمانت غم''، ''لہو کا سراغ''، ''شورش بربط پا''، ''متعین آوازیں'' بھی مزاحمت کے لحاظ سے توجہ طلب نظمیں ہیں۔ علاوہ ازیں واسوخت ''تم یہ کہتے ہو اب کوئی چارہ نہیں''، ''آج بازار میں پابجولاں چلو''، ''دِلدار دیکھنا''، ''مرے دِل مرے مسافر''، ''ہم تو مجبورِ وفا ہیں، کیا کریں''، ''ادھر نہ دیکھو'' بھی مزاحمتی نوعیت کی نظمیں ہیں۔

فیض نے اُردو شاعری کی مزاحمتی شاعری میں ایک نئی اور جان دار روایت قائم کرنے کی کوشش کی۔ دراصل فیض ان شاعروں میں سے نہیں جو خلا میں شاعری کرتے ہیں، اپنے ماحول سے کٹ کر شاعری تخلیق کرتے ہیں۔ فیض نے تو آج کی دنیا کے جملہ سیاسی، سماجی اور اقتصادی محرکات کے شور وشغب میں اشعار کہے ہیں اور جو کچھ کہا ہے بڑے اعتماد سے کہا ہے اس لیے انھیں ساری دنیا میں اُبھرتے ہوئے نئے انسان کی صلاحیت اور قوت پر اعتماد ہے اس لیے ان کا نغمہ ارضی بھی ہے اور رجائی بھی۔

جا بجا بکتے ہوئے کوچہ و بازار میں جسم
خاک میں لتھڑے ہوئے خون میں نہلائے ہوئے (۲)

دیگر شعرا کی طرح فیض بھی رومانی تجربوں سے کھیلتے ہیں۔ ذہنی کشمکش میں مبتلا ہوتے ہیں اور رومان کی دنیا چھوڑ کر حقیقت کی دُنیا میں جا پہنچتے ہیں لیکن وہ رومان کی دنیا میں رہیں یا حقیقت کی دنیا میں، فنی تقاضوں کو نہیں بھولتے اور خود ضبطی سے مسلسل کام لیتے ہیں۔

فیض کی شاعری میں ایسے اشعار بھی بدرجۂ اتم موجود ہیں جن میں مزاحمت اور احتجاج کو موضوعِ سخن بنایا گیا ہے۔ مزاحمت کا اصل سبب ناآسودگی ہے۔ خواہ یہ ناآسودگی انفرادی ہو یا اجتماعی، معاشی ہو یا سماجی۔ گویا ناآسودگی کا اظہار مزاحمت کی پہلی سیڑھی ہے یعنی اگر کسی شاعر کی شاعری میں سماجی، معاشی معاملات کی طرف ناآسودگی نہ ہو تو پھر اس

کے کلام میں مزاحمت کے عناصر بھی نہیں ہوں گے۔

آج تک شیخ کے اکرام میں جو شے تھی حرام
اب وہی دشمنِ دیں، راحتِ جاں ٹھہری ہے(۳)

فیض کا شمار ان شاعروں میں ہے جنھوں نے اپنی تخلیقات کی بنیاد ترقی پسند تحریک کے عطا کردہ سیاسی شعور پر رکھی اور دوسری طرف ان فنی اور جمالیاتی تقاضوں سے بھی عہدہ برآ ہوئے جو اعلیٰ ادبی تخلیقات کی اساس ہیں۔ فیض کا شمار ان ترقی پسند شعرا میں ہوتا ہے جنھوں نے اس نظریے کی ترویج میں قابلِ تحسین کردار ادا کیا۔ آزادیِ فکر، آزادیِ اظہار، احترامِ آدمیت اور انسانی اقدار کی بحالی اور پاسداری یہ وہ عناصر ہیں جو فیض کی آواز کو ایک مخصوص نظریے ہی کی نہیں بل کہ اپنے عہد کی توانا آواز بناتے ہیں۔ فیض کے شعری رویے کے متعلق سید خورشید عالم لکھتے ہیں:

> ''فیض کی شاعری میں تفکر کا دھارا اس عالمی تحریک اور ترقی پسندی کی جانب ہے جو سماج کی ازسرِ نو تشکیل، آزادی اور برابری ذاتوں اور ملّتوں کی مفاہمت کو اپنے نظریے کی بنیاد بنا کر سچائی کے سائے تلے ایک بہتر تہذیب کی تعمیر اس کا مطمحِ نظر ہے۔ فیض جانتے تھے کہ وہ ایک فرد ہی نہیں بل کہ ایسے شاعر اور مصنّف ہیں جو اپنے مخصوص وقت اور عہد میں ان تخلیقات کے موجد ہیں جس کے لیے وہ اپنے سماج کے سامنے جواب دہ ہیں(۴)۔''

ترقی پسند تحریک کا اساسی تصور ایک ایسے انقلاب کی جانب پیش قدمی تھی جو غیر طبقاتی سماج کو وجود میں لائے۔ اس تحریک کے پیرو موجودہ معاشرے اور سیاست سے اس حد تک غیر مطمئن تھے کہ ان کے نزدیک سماجی قدروں کو جڑ سے اُکھاڑ پھینکنا ضروری تھا جو استحصالی نظام کی پہچان تھی چناں چہ سرخی شفق کی ہو یا لہو کی وہ مجموعی طور پر ترقی پسند ادب میں بھی اور فیض کے ہاں انقلاب کی علامت بنی۔ اسی طرح دار و رسن کی علامت ایک طرف تو اس ناانصافی اور استحصالی رویے کی نمایندہ بنی جو آمریت پسندوں اور جمہوری قدروں سے ناآشنا متعدد قوتوں میں مروّج تھا تو دوسری طرف یہ دار و رسن انقلاب چاہنے والوں کے لیے حصولِ منزل کا وہ راستہ تھا جس پر چل کر وہ منزل حاصل کر سکتے تھے اس طرح ''تاریکی'' اور ''سیاہی''، ظلم اور استحصال کی ان قوتوں کی علامتیں ہیں جو انسان کی شخصی آزادی اور اقوام کی مجموعی آزادی کی سدِّ راہ ہیں اور ''رات''، ''تاریکی'' اور ''سیاہی'' کے ساتھ ہی فیض کے ہاں ان کے رجائی سیاسی لہجے کی بدولت سحر، صبحِ درخشاں، سورج اور روشنی نویدِ انقلاب اس نئی زندگی کی علامتیں ہیں:

رات کا گرم لہو اور بھی بہہ جانے دو

یہی تاریکی تو ہے غازۂ رُخسارِ سحر
صبح ہونے ہی کو ہے اے دلِ بے تاب ٹھہر (۵)

فیض کی شاعری کا اہم ترین پیرایہ مزاحمتی شاعری ہے جو انھیں معاصر ترقی پسند شعرا سے ممتاز بناتی ہے بل کہ فیض کے شعری سرمائے کی نمایندہ ترین شاعری بھی ہے۔ انھوں نے تلخ صورتِ حالات کے بیان میں بھی عمومی طور پر نرم اور مدھم لب ولہجہ اختیار کیا۔

ڈاکٹر ابوسعید نورالدین لکھتے ہیں:

''فیض کا تعلق بہت حد تک ترقی پسند تحریک سے رہا ہے... اس تحریک کے ماتحت اُردو میں جو ادب وجود میں آیا، اسے باغیانہ ادب سے موسوم کیا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ لیکن اس سلسلے میں فیض کا لب ولہجہ ہمیشہ ذرا مدھم رہا ہے۔ ان کی لے کبھی حدِ اعتدال سے آگے نہیں بڑھی (۶)۔''

فیض نے سماجی حقائق سے قاری کو متعارف کرایا اور اسے بہتر اور خوب تر مادّی زندگی کی جھلک دکھائی۔ فیض سے پہلے اگرچہ رومان اور حقیقت کے الگ الگ خانے تھے۔ فیض نے ان دونوں صورتوں کو مربوط کیا اور رومان کی حسین فضا سے گزار کر حقائق کی چٹانوں تک لے گئے اور جب قاری کو زندگی کے نشیب وفراز سے تعارف حاصل ہو گیا تو اس نے نہایت فن کاری سے قاری کو ایسی منزل کی جانب متوجہ کیا جہاں پہنچ کر شاعر کا خیال ہے کہ غم کے دھندلکے چھٹ جائیں گے اور فرد کو ایک نئی زندگی حاصل ہو جائے گی۔ فیض نے معاشرے کے نشیب وفراز بالخصوص مادّی اور معاشی ناہمواری کو بے نقاب کیا۔ اس عنصر کا آغاز ''نقشِ فریادی'' سے ہوا اور نقشِ فریادی سے ہوتا ہوا ''دستِ صبا'' اور ''زنداں نامہ'' میں اس کی صدائے بازگشت مسلسل سنائی دیتی رہی ہے۔ مثلاً:

ان دمکتے ہوئے شہروں کی فراواں مخلوق
کیوں فقط مرنے کی حسرت میں جیا کرتی ہے؟
یہ حسیں کھیت پھٹا پڑتا ہے جوبن جن کا (۷)

پروفیسر ڈاکٹر محمد کامران لکھتے ہیں:

''فیض نے جہاں حسن وعشق اور انسان دوستی کے تصورات سے اپنی شاعری کا کینوس سجایا وہاں زندگی میں ناانصافی، استحصال اور سماجی عدم توازن کے خلاف اپنے مشاہدات وتجربات کو شاعری کے سایے میں ڈھال کر خاموش لبوں کو قوتِ

گویائی عطا کی۔ مظلوموں میں اپنے حقوق کا شعور بیدار کیا اور محبت کے روایتی
دائرے میں وسعت پیدا کرتے ہوئے انسانیت کو محبت کا مسلک اور محور و مرکز بنا
دیا(۸)۔''

فیض اس نظریہء حیات کے فروغ کے پرچار ہیں جس میں تمام بنی نوعِ انسان برابر تصور کیے جاتے ہیں۔ نام و نسب، مال و دولت اور جاہ و منصب جیسی انسانی خصوصیات انسانی برتری پر اثر انداز ہوتی رہیں مگر فیض جس دنیا کے باسی تھے وہاں تصورِ حیات اور نظامِ حیات ان کے نظریے سے بالکل مختلف تھا۔ معاشرے میں عام آدمی ذلت کی زندگی بسر کر رہا تھا اور اسے شودر سمجھا جاتا اور مزارعہ، کمی کمین کے القابات سے نوازا جاتا۔ اس صورتِ حالات میں فیض کو یہ انسان (اشرف المخلوقات) کے درجے سے خارج نظر آیا۔ اس پسے ہوئے انسان کی تصویر کشی فیضؔ نے اپنی نظم ''کتے'' میں علامتی انداز میں کی ہے۔ یہ نظم ان سیاسی و معاشرتی حقائق کی تلخی اور سنگینی کو بھی ظاہر کرتی ہے جن سے اس زمانے کا عام آدمی دوچار تھا۔ اور فیض کے معاشرے اور سیاست کے اس غیر انسانی رویے کے بارے میں شدتِ احساس کو بھی ظاہر کرتی ہے۔ زندگی گزارنے کے لیے چھوٹی چھوٹی ضرورت سے محروم انسان ان ضرورتوں کے حصول کے لیے کتوں کی طرح باہم دست و گریباں نظر آتے ہیں۔ ان کا یہ عمل اگرچہ انھیں انسانی سطح سے بھی گرا دیتا ہے، مگر اس کی وجہ فیض کے نزدیک وہ نظام ہے جو ان پر مسلط کر دیا گیا ہے۔

نہ آرام شب کو، نہ راحت سویرے
غلاظت میں گھر، نالیوں میں بسیرے
جو بگڑیں تو اک دوسرے سے لڑا دو
ذرا ایک روٹی کا ٹکڑا دِکھا دو
یہ ہر ایک کی ٹھوکریں کھانے والے
یہ فاقوں سے اُکتا کے مر جانے والے(۹)

فیض کی پیشِ نظر نظم ''کتے'' اس انسان کی سرگذشت ہے جو زمانے کے استبداد کے سیلِ رواں اور تھپیڑوں کی زد میں ہے یہاں انھوں نے تھکے ہارے اور مظلوم انسان کو کانچ کی مانند قرار دیا ہے جس پر ہر طرف سے استحصال اور جبر کے تھپڑوں کی بارش ہو رہی ہوتی ہے۔

ڈاکٹر جمیل جالبی کے نزدیک:

''فیض جبر و استحصال کے دشمن تھے۔ عدل و انصاف کے داعی تھے۔ عوام کو انسانی

قوتوں کا سرچشمہ سمجھتے تھے۔ وہ عوام جن سے قوموں کی کھیتیاں سرسبز و شاداب ہو
جاتی ہیں۔ صنعت و حرفت پھلنے پھولنے لگتی ہے اور زندگی کے چشمے ابلنے لگتے ہیں۔
ان کی شاعری عوام کی اسی قوت کی ترجمان ہے(۱۰)۔''

فیضؔ نے جب سماجی شعور حاصل کیا تو انھیں یہ جان کر حیرت ہوئی کہ وہ اور اُن کی قوم جن مسائل سے دوچار ہیں وہ مسائل نئے نہیں بل کہ انسانوں کے مابین یہ تضادات مدتوں سے چلے آ رہے ہیں۔ ہر دور میں انسان دو گروہوں میں بٹ جاتے ہیں۔ ایک گروہ ظلم کرتا ہے اور ایک سہتا ہے۔ ایک انصاف چاہتا ہے ایک اس کی راہ میں روڑے اٹکاتا ہے۔ ایک انسانوں کو ترقی کی جانب لے جانا چاہتا ہے اور دوسرا تنزلی کی جانب۔

فیضؔ اس ازلی جنگ کے ادراک کا اظہار کچھ یوں کرتے ہیں:

یونہی ہمیشہ الجھتی رہی ہے، ظلم سے خلق
نہ ان کی رسم نئی ہے نہ اپنی رِیت نئی
یونہی ہمیشہ کھلائے ہیں ہم نے آگ میں پھول
نہ اُن کی ہار نئی ہے نہ اپنی جیت نئی(۱۱)

فیضؔ کو جب انفرادی، اجتماعی اور تاریخی عوامل کا شعور حاصل ہوا تو ان پر یہ حقیقت عیاں ہوئی کہ لاکھوں انسان ظلم کی چکی میں پس رہے ہیں۔ ایک حساس انسان کی طرح ان کے دِل میں بھی ظالموں کے خلاف غصے اور نفرت کا لاوا اُبھرا اور اشعار کی صورت میں بہنے لگا۔ انھوں نے استحصال کی چکی میں پسنے والے عوام کو نہ صرف عمل کی دعوت دی بل کہ جنگ کا اعلان کیا اور انقلاب کے گیت گانے شروع کیے۔

ہم نے مانا جنگ کڑی ہے
سر پھوٹیں گے ، خون بہے گا
خون میں غم بھی بہہ جائیں گے
ہم نہ رہیں گے ، غم بھی نہ رہے گا(۱۲)

ایک جگہ کہتے ہیں:

دربارِ وطن میں جب اک دن سب جانے والے جائیں گے
کچھ اپنی سزا کو پہنچیں گے، کچھ اپنی جزا لے جائیں گے
اے خاک نشینو اٹھ بیٹھو ، وہ وقت قریب آ پہنچا ہے

جب تخت گرائے جائیں گے، جب تاج اچھالے جائیں گے
اب ٹوٹ گریں گی زنجیریں اب زندانوں کی خیر نہیں
جو دریا جھوم کے اُٹھے ہیں، تنکوں سے نہ ٹالے جائیں گے
کٹتے بھی چلو، بڑھتے بھی چلو، بازو بھی بہت ہیں، سر بھی بہت
چلتے بھی چلو، کہ اب ڈیرے منزل ہی پہ ڈالے جائیں گے
اے ظلم کے ماتو لب کھولو، چپ رہنے والو چپ کب تک
کچھ حشر تو اِن سے اُٹھے گا، کچھ دور تو نالے جائیں گے (۱۳)

کلامِ فیض نے قارئین کو درد و سوز، جلال و جمال، امید و یقین، عزم و استقلال عطا کیا۔ ان کے فن میں خونِ جگر کی آمیزش سے صداقت آئی جس میں تڑپ بھی ہے اور جوش بھی، سادگی بھی اور رعنائی بھی۔ فیض کی شاعری میں ایک ایسی کشش ہے جو قارئین کے دلوں کو موہ لیتی ہے۔ ایک ایسی آنچ ہے جو سیکڑوں دِلوں کو پگھلا دیتی ہے۔

صبح کی طرح چمکتا ہے شبِ غم کا اُفق
فیض تابندگیٔ دیدۂ نم تو دیکھو (۱۴)

فیض نے سیاسی شاعری بھی کی اور اپنی نظموں کو پیغام کا ذریعہ بنایا لیکن حسن و عشق کی علامتوں کا سہارا لیا۔ ان کی شاعری سے مترشح ہے کہ فیض کسی مجازی محبوب کا ذکر کر رہے ہیں جب کہ دراصل ذکر ہوتا ہے اپنے ملک و قوم کا یا اپنے اہلِ وطن کی آزادی اور خوشحالی کا۔ ان کی ایک مشہور نظم ''تنہائی'' ہے۔

پھر کوئی آیا دِلِ زار نہیں کوئی نہیں
راہرو ہو گا کہیں اور چلا جائے گا (۱۵)

فیض کی شاعری ان کے تہذیبی، ادبی، معاشرتی پس منظر اور ترقی پسندی، روشن خیالی اور انسان دوستی کی فضا سے ترتیب پاتی ہے۔ اس فضا کی تخلیق میں ان کا عصری اور سیاسی شعور کارفرما نظر آتا ہے۔ اظہار کاظمی لکھتے ہیں:

''فیض کی وہ دنیا جو اُن کی شاعری کے دوسرے دور میں نظر آتی ہے۔ وہ ایک ایسے رومانی وجود کی دنیا ہے جو حقیقت سے آنکھیں چار کرتے ہوئے آگے بڑھنے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہا تھا اور سماجی ناانصافیوں، معاشی استحصال، مذہبی منافقت اور سیاسی جبر کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا (۱۶)۔''

فیض غمِ جہاں کو سینے سے لگا لینے کے بعد انسانی مشکلات کا حل بھی پا جاتے ہیں اور حصولِ مقصد کے لیے تازہ

تدبیریں بتانے لگتے ہیں۔مثلاً:

بے فکرے دھن دولت والے
آخر کیوں خوش رہتے ہیں
اُن کا سُکھ آپس میں بانٹیں
یہ بھی آخر ہم جیسے ہیں(۱۷)

ان اشعار میں سوئے ہوئے انسان کو بیدار کرنے اور اسے ظلم و جبر کا احساس دِلانے کی روش موجود ہے۔فیض کو اپنے خلوص کی رہنمائی اور کامرانی پر پورا یقین ہے وہ جانتے ہیں کہ عوام سامراج کے ظلم کی گھنی چھاؤں میں بھی دم لینے پر مجبور کیے جاتے ہیں لیکن ان کی دُوررس اور نتیجہ خیز نگاہیں فرنگی استبداد کے نہ ڈوبنے والے سورج کے رُخ پر زوال کے آثار دیکھ لیتی ہیں اور وہ سمجھ جاتے ہیں کہ برطانوی سامراج کا دیوزیادہ دنوں تک سچائی اور ایثار وخلوص کے آگے نہ ٹھہر سکے گا۔لہٰذا جب انھوں نے دیکھا کہ معرکہء آزادی میں اُن کے ساتھیوں کے حوصلے پست ہورہے ہیں تو حوصلہ مندی کے ساتھ اُنھیں سمجھاتے ہیں کہ:

اور کچھ دیر ستم سہہ لیں، تڑپ لیں، رولیں
لیکن اب ظلم کی معیاد کے دن تھوڑے ہیں
اجنبی ہاتھوں کا بے نام گرانبار ستم
آج سہنا ہے، ہمیشہ تو نہیں سہنا ہے(۱۸)

فیض نے جہاں ''کتے'' اور ''بول'' کے ذریعے کمزور اور نچلے طبقے کے جذبۂ غیرت کو اُبھارا اور سامراجی طاقتوں سے مقابلے کا حوصلہ پیدا کیا وہاں انھوں نے ''موضوعِ سخن'' کے ذریعے ادیبوں اور شاعروں کو بھی سماجی زندگی کی تگ ودو میں اپنے فرائض کی ادائی کا احساس دِلایا۔لیکن یہ سب کچھ انھوں نے فکر وفن کی گہرائیوں کی مدد سے کیا۔وہ ایک اطمینان بخش فضا پیدا کرتے ہوئے کہتے ہیں:

صبح ہونے ہی کو ہے اے دلِ بیتاب ٹھہر
جلد یہ سطوتِ اسباب بھی اُٹھ جائے گی
یہ گرانبارئ آداب بھی اُٹھ جائے گی
خواہ زنجیر چھنکتی ہے، چھنکتی ہی رہے(۱۹)

فیض کی شاعری میں مزاحمتی عناصر بدرجہء اتم موجود ہیں وہ کبھی انقلاب کی بات کرتے ہیں تو کبھی تغیر وتبدل کی،

کبھی محبوب کی محبت میں گرفتار نظر آتے ہیں تو کبھی وطن کو اپنی بہترین محبوبہ بنا لیتے ہیں۔ وہ نوجوانوں کو متحرک رہنے کی تلقین کرتے ہیں۔ وہ اپنی شاعری میں ایسا جوش و ولولہ پیدا کرتے ہیں ان کی شاعری سے قاری جان لیتا ہے کہ فیض انقلابی شاعر ہیں۔

غلامی میں زندگی اپنی ساری نعمتوں سے محروم ہو جاتی ہے۔ غلام انسان کا تن من دھن زبان کچھ بھی اپنا نہیں ہوتا۔ وہ ظلم کے خلاف آواز اُٹھاتے ہوئے اور اپنی مصیبتوں کا ذکر کرتے ہوئے بھی ڈرتا ہے۔ فیض اس نفسیاتی کشمکش سے واقف ہیں وہ مظلوموں کی ہمت افزائی کرتے ہیں اور انھیں اظہارِ خیال کی جرأت دِلاتے ہیں:

بول ، کہ لب آزاد ہیں تیرے
بول، زباں اب تک تیری ہے(۲۰)

فیض کے کلام میں زندگی کے تلخ حقائق بھی دِکھائی دیتے ہیں۔ ان کی شاعری میں غربت وفلاکت کے عناصر بھی ملتے ہیں۔ فیض مایوس نہیں ہوتے خواہ کیسی ہی مشکلات کیوں نہ ہوں وہ ہمت نہیں ہارتے۔ وہ ظلم وستم کے خاتمے پر یقین رکھتے ہیں۔ فیض سماجی، معاشی ناہمواری کو تمام عمر محبوب کے تصورِ خیال کی طرح اپنے سینے سے چمٹاتے رہے۔ انھوں نے اُردو شاعری کو نیا آہنگ نیا عزم اور نیا حوصلہ دیا اور کہتے ہیں:

ہم پرورشِ لوح و قلم کرتے رہیں گے
جو دِل پہ گزرتی ہے رقم کرتے رہیں گے(۲۱)

فیض کی شاعری محض ایک فرد کی سوچ کے طور پر ظاہر نہیں ہوتی بل کہ فیض اپنی ذات کو باقی دنیا کے عوام کے ساتھ باہم متصل کر کے نہ صرف سماج کی آواز بنتے ہیں بل کہ ان کی شاعری اجتماعیت کے کامل احساس کی آئینہ دار بھی ہے۔

فیض نے محکوم ومجبور اقوام کی حمایت بلاتخصیص اور بلاتفریق کی ہے۔ انھوں نے دنیا کے ہر مظلوم کے لیے آواز بلند کی چاہے وہ فلسطین کے محکوم عوام ہوں یا ایران کے یا پھر افریقا کے مظلوم عوام ہوں۔ فیض کی ہمدردیاں سب کے لیے یکساں تھیں۔ افریقی عوام کی آزادی کی حمایت کے لیے ان کی نظم ''آجاؤ افریقا'' بہت مقبول ہوئی۔ یہ نظم ۱۹۵۵ء میں لکھی گئی۔ جب فیضؔ راولپنڈی سازش کیس کے سلسلے میں جیل میں تھے۔

دھرتی دھڑک رہی ہے مرے ساتھ ایفریقا
دریا تھرک رہا ہے تو بن دے رہا ہے تال
میں ایفریقا ہوں، دھار لیا میں نے تیرا روپ
میں تو ہوں، میری چال ہے تیری ببر کی چال

'آجاؤ ایفریقا'
آؤ ببر کی چال
'آجاؤ ایفریقا' (۲۲)

فیض زندگی کے ٹھوس حقائق کو دیکھتے ہیں۔ معاشی بے اعتدالیوں، ظلم، کساد بازاری، اجتماعی پریشانیوں کا جائزہ لیتے ہیں اور ناظر کو ایک نئے سماجی شعور سے آشنا کرانے کے لیے حرکت کرنے، پرانے بتوں کو توڑنے اور زندگی کی نفرت انگیز ناہمواریوں کو ختم کرنے کی تلقین کرتے ہیں۔ اس تمام عمل کے دوران ان کی نگاہیں اس منزل پر مرکوز رہتی ہیں جہاں پہنچ کر سارے دکھ ختم ہو جائیں گے اور افراد کی تمام مصیبتیں، پریشانیاں ختم ہو جائیں گی جہاں رات کی سیاہی پر سحر کا اُجالا مسلط ہوگا اور نیا انسان ایک نئے عزم کے ساتھ زندگی کی شاہراہ پر آغازِ سفر کر سکے گا۔

کلامِ فیض کا ایک بڑا وصف یہ ہے کہ وہ یاس کی بجائے آس کی، ناامیدی کے بجائے امید کی اور قنوطیت کے بجائے رجائیت کا علمبردار ہے۔ ان کا کلام ٹوٹے ہوئے دلوں کی امید بندھاتا ہے اور پریشان حال عوام کو نوید سناتا ہے۔ ذاتی طور پر قید و بند کے مصائب سہنے اور زمانے کے آلام و صدمات کا شکار بننے کے باوجود انھوں نے مایوسی کے آگے ہتھیار نہیں ڈالا۔ بل کہ رجائیت کا علم تھامے رکھا۔ فیض اپنی نظم ''چند روز اور مری جاں'' میں عزم و یقین کے ساتھ مخاطب ہیں اور اہلِ وطن ہمت بڑھا کر مستقبل کی جانب اشارہ کرتے ہیں۔

چند روز اور مری جان، فقط چند ہی روز
ظلم کی چھاؤں میں دَم لینے پہ مجبور ہیں ہم
اور کچھ دیر ستم سہہ لیں، تڑپ لیں، رو لیں
اپنے اجداد کی میراث ہے، معذور ہیں ہم

چناں چہ سنگین حالات میں بھی وہ اپنے قاری کا حوصلہ بڑھاتے، اس کے دل کی ڈھارس بندھاتے اور ظلمتِ شب کے ختم ہونے اور سحر کے طلوع ہونے کی خوشخبری دیتے ہیں۔

فیض کے نقطۂ نظر کا ایک جزو ہے بیداری اور روشن مستقبل کی امید۔ یہ عنصر ''نقش فریادی'' سے ''زنداں نامہ'' تک واضح دِکھائی دیتا ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا ''نظمِ جدید کی کروٹیں'' میں لکھتے ہیں:

''معمولی سا فرق یہ ہے کہ ''نقش فریادی'' میں فیضؔ نے حال کے حقائق کو نسبتاً زیادہ اہمیت دی تھی اور اس پر صورتِ حالات کی کرب ناک کیفیت کو شکست و یاس کو نسبتاً زیادہ مسلط کر دیا تھا۔ لیکن ''دستِ صبا'' اور ''زنداں نامہ'' میں فیض نے کھلم کھلا

بغاوت کو ہوا دی ہے اور ان مجموعوں میں شکست خوردہ احساسات امید کی لو سے دمکتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ تاہم بغاوت کی رو اور مستقبل کی طرف آنکھ اٹھانے کی یہ روش کسی تدریجی ارتقا کا نتیجہ نہیں بل کہ ''نقشِ فریادی'' میں اُبھرنے والے نقطۂ نظر ہی کا پرتو ہے (۲۳)۔''

مختصر یہ کہ فیض کی شاعری کا مقصد عوام کے دلوں میں انقلاب پیدا کرنا تھا ان کے جذبوں کو تازہ کرنا اور عقل کو فہم و فراست عطا کرنا تھا۔ ان کی شاعری کی عظمت کا راز اس امر میں بھی پوشیدہ ہے کہ اپنی تمام تر نظریاتی و فلسفیانہ وابستگی کے باوجود شعریت کے اخراج سے خود کو بچا لیا۔ انھوں نے شعوری طور پر اپنی شاعری کے ذریعے پاکستان کی نامساعد سماجی، سیاسی اور معاشی صورتِ حالات کے خلاف احتجاج کیا۔ مزاحمت کی آواز بلند کی، بغاوتیں بھی کیں اور عوام کو انقلاب کی بشارتیں بھی دیں اور انھیں نویدِ صبح کی خوش خبری بھی دی۔

حواشی:

(۱) فیض احمد فیض، نسخہ ھائے وفا (لاہور: مکتبۂ کارواں)، ص ۴۵۳۔
(۲) ایضاً، ص ۴۶۳۔
(۳) ایضاً، ص ۱۶۴۔
(۴) خورشید عالم، سیّد، دستِ قاتل کو جھٹک دینے کا عمل، مشمولہ: فیض کے مغربی حوالے، مرتبہ: اشفاق حسین (لاہور: جنگ پبلشرز، ۱۹۹۲ء)، ص ۱۱۹۔
(۵) فیض احمد فیض، محوّلہ بالا، ص ۱۰۸۔
(۶) ابوسعید نورالدین، ڈاکٹر، تاریخ ادبیاتِ اُردو، حصّہ دوم اُردو نظم (لاہور: مغربی اکیڈمی، ۱۹۹۷ء)، ص ۱۰۵۷۔
(۷) فیض احمد فیض، محوّلہ بالا، ص ۹۰۔
(۸) محمد کامران، ڈاکٹر، اُردو زبان و ادب کی مختصر تاریخ (لاہور: ماورا پبلشرز، ۲۰۱۱ء)، ص ۱۵۷۔
(۹) فیض احمد فیض، محوّلہ بالا، ص ۷۹۔
(۱۰) جمیل جالبی، ڈاکٹر، معاصر ادب (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۱ء)، ص ۲۲۰۔
(۱۱) فیض احمد فیض، محوّلہ بالا، ص ۱۶۳۔
(۱۲) ایضاً، ص ۶۶۔
(۱۳) ایضاً، ص ۱۳۸۔
(۱۴) ایضاً، ص ۲۳۴۔
(۱۵) ایضاً، ص ۱۷۔
(۱۶) اظہار کاظمی، فیض احمد فیض، شاعرانہ اظہار اور سماجی و سیاسی تبدیلی، مشمولہ: فیض کے مغربی حوالے، مرتبہ: اشفاق حسین (لاہور: جنگ پبلشرز، ۱۹۹۲ء)، ص ۳۹۲۔

(۱۷) فیض احمد فیض، محوّلہ بالا، ص ۶۶۔
(۱۸) ایضاً، ص ۱۰۸۔
(۱۹) ایضاً، ص ۸۱۔
(۲۰) ایضاً، ص ۷۳۔
(۲۱) ایضاً، ص ۱۱۹۔
(۲۲) ایضاً، ص ۲۷۵۔
(۲۳) وزیر آغا، ڈاکٹر، نظمِ جدید کی کروٹیں (لاہور: سنگت پبلشرز، ۲۰۰۷ء)، ص ۸۷۔

مآخذ:

۱۔ آغا، وزیر، ڈاکٹر، نظمِ جدید کی کروٹیں، لاہور: سنگت پبلشرز، ۲۰۰۷ء۔
۲۔ جالبی، جمیل، ڈاکٹر، معاصر ادب (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۱ء)، ص ۲۲۰۔
۳۔ خورشید عالم، سیّد، دستِ قاتل کو جھٹک دینے کا عمل، مشمولہ: فیض کے مغربی حوالے، مرتبہ: اشفاق حسین، لاہور: جنگ پبلشرز، ۱۹۹۲ء۔
۴۔ فیض، فیض احمد، نسخہ ھائے وفا، لاہور: مکتبۂ کارواں۔
۵۔ کاظمی، اظہار، فیض احمد فیض، شاعرانہ اظہار اور سماجی و سیاسی تبدیلی، مشمولہ: فیض کے مغربی حوالے، مرتبہ: اشفاق حسین، لاہور: جنگ پبلشرز، ۱۹۹۲ء۔
۶۔ کامران، محمد، ڈاکٹر، اُردو زبان و ادب کی مختصر تاریخ، لاہور: ماورا پبلشرز، ۲۰۱۱ء۔
۷۔ نورالدین، ابوسعید، ڈاکٹر، تاریخ ادبیاتِ اُردو، حصّہ دوم اُردو نظم، لاہور: مغربی اکیڈمی، ۱۹۹۷ء۔